مرزا اطہر بیگ کے افسانوں میں تغیر پذیر سماجی اقدار کی عکاسی کا تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

Research and Critical Study of the Reflection of Changing Social values in Mirza Athar Baig's fiction

سدرہ طاہر
(پی ایچ۔ڈی سکالر)
نیشنل یونی ورسٹی آف ماڈرن لینگویجز، اسلام آباد

Abstract;

Society came into being by a group of people's. Each society has its own values which help them to survive and develop. Society is never precisely the same from one moment to the next. Change is very core of life. Society accepts global influences. It is affected by all sorts of factors, problems and development projects. Social change breaks the traditional process that gives rise to new demands. As a society develops and accepts the effects of other factors, its values has also change. It absorbs some new beliefs, customs, values, and practices. Sociologists have studied this variability from different angles and have tried to examine the social causes that lead to a change in the values of society. There are three major perspectives of sociology (Symbolic, Functionalism and Conflict). This article examines the reflection of changing social values in the fiction of Mirza Athar

Baig in the context of Social theory given by famous sociologist “Emile Durkheim”.

کلیدی الفاظ: معاشرہ۔ سماجیات۔ ایمائل ڈرخائم۔ سماجی اقدار۔ تغیر پذیری۔ انسانی استحصال۔ عصر حاضر۔ مرزا اطہر بیگ۔ صنعتی ترقی

معاشرہ افراد کا مجموعہ ہے۔ ہر معاشرہ اپنی اقدار کی بدولت ہی ترقی کرتا اور زندہ رہتا ہے۔ وقت کی چلن اور رفتار نے جہاں نئے نئے در وا کیے ہیں وہیں معاشرتی اقدار میں بھی تغیر برپا ہوا۔ جس نے معاشرے کو مثبت اور منفی دونوں صورتوں میں متاثر کیا ہے۔ اس تغیر پذیری کو ادب کے مطالعہ سے بھی عیاں کیا جا سکتا ہے۔ ماہرین سماجیات نے معاشرتی اقدار کی اس تغیر پذیری کا مختلف حوالوں سے مطالعہ کیا اور ان سماجی وجوہات کا جائزہ لینے کی کوشش کی ہے جن کی بنا پر معاشرے کی اقدار میں تبدیلی رونما ہوتی ہے۔ اس مقالے میں مشہور ماہر سماجیات ایمائل ڈرخائم کے سماجی نظریے کے تناظر میں مرزا اطہر بیگ کے افسانوں میں تغیر پذیر سماجی اقدار کا جائزہ لیا گیا ہے۔

سماجیات، معاشیات اور فلسفے میں لفظ قدر (جمع اقدار؛ انگریزی متبادل “Values”) کے مختلف مفہوم ہیں۔ معاشیات میں اس سے مراد "قیمت" ہے، فلسفے میں قدر اخلاقیات کا موضوع ہے جب کہ عمرانیات میں قدر کا مفہوم مختلف ہے۔ اس میں اقدار سے مراد معاشرے کے وہ معیار ہیں جن کو اہمیت دی جاتی ہے۔ جنہیں معاشرے میں نہ صرف پسند کیا جاتا ہے بلکہ ان کے حصول کے لیے افراد کوشش کرتے ہیں، وقت اور پیسہ صرف کرتے ہیں۔ ان اقدار کو معاشرہ جائز طریقے سے کرنے کی اجازت دیتا ہے۔ ماہر سماجیات سی این شنکر راؤ مختلف ماہرین سماجیات کی تعریفوں کو مد نظر رکھتے ہوئے اقدار کی تعریف ان الفاظ کرتے ہیں:

> “Values are the criteria people use in assessing their daily lives, arranging their priorities, measuring their pleasures and pains...In simple words, Values may be defined as measure of goodness or desirability”(1)

ترجمہ: اقدار وہ معیار ہیں جن کو افراد اپنی روز مرہ زندگی کی ترجیحات میں خوشی اور غم کے مطابق ترتیب دیتے ہیں۔۔۔ سادہ الفاظ میں اقدار سے مراد وہ معیار ہیں جن کو ضرورت کے پیش نظر پسند کیا جاتا ہے۔

ان اقدار کو معاشرے کے افراد ترتیب دیتے ہیں۔ عام طور پر کچھ اقدار دائمی ہوتی ہیں جن میں رد و بدل نہیں ہو سکتا، یہ دائمی اقدار بھی صرف اور صرف اخلاق اور اخلاقیات کے تناظر میں دیکھی جا سکتی ہیں یا جن معاشروں میں مذہب کی بالادستی ہے وہاں کچھ مذہبی اقدار موجود ہیں۔ لیکن بغور پرکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

ان اقدار کا تعلق ملک کے نظام معیشت و سیاست سے بھی ہوتا ہے اور ملک میں موجود افراد معاشرہ اور بالخصوص بالادست طبقات اپنی ضروریات کے تحت ان اقدار میں تبدیلیاں کرتے رہتے ہیں یہی وجہ ہے کہ بہت سے ملکوں میں سرکاری مذہب بیک وقت ایک ہی ہوتا ہے لیکن نظاموں کے اختلاف کے باعث سماجی، اخلاقی، سیاسی، تہذیبی اور ثقافتی اقدار الگ تھلگ ہوتی ہیں مثال کے طور پر پاکستان میں ایک کثیر تعداد میں مسلمان طبقہ موجود ہے یہی وجہ ہے کہ یہاں کا سرکاری مذہب اسلام ہے مگر یہاں دیگر مذاہب سے تعلق رکھنے والے لوگ بھی موجود ہیں اس لیے مذہبی اقدار مختلف ہو سکتی ہیں لیکن سماجی اقدار مختلف نہیں ہوتی۔ لہٰذا یہ سماجی اقدار تبدیل بھی ہو سکتی ہیں۔ ان اقدار میں مال و دولت، اعلی تعلیم، اچھا رہن سہن، بزورگوں کا احترام، اداروں کا احترام وغیرہ شامل ہے۔ معاشرے کا ہر فرد اعلی تعلیم کے حصول، اچھے رہن سہن وغیرہ کی طرف خاص توجہ دیتا ہے اس سے مراد یہ ہے کہ یہ معاشرے کی قدروں کے طور پر نمایاں ہیں۔ اس کی مثال اس طرح پیش کی جا سکتی ہے کہ کچھ عرصہ پہلے تک عام اور سادہ لباس زیب تن کرنے کو اہمیت دی جاتی تھی اور معاشرہ سادگی پسند تھا لیکن اب اس کی جگہ برینڈ کلچر نے لے لی ہے۔ جس کی وجہ مارکیٹ اکانومی ہے۔ ایمائل ڈرخائم کا نظریہ معاشرتی حقائق بھی اس بات پر زور دیتا ہے کہ معاشرے کے کسی ایک ادارے میں خرابی پورے معاشرے کی خرابی کا سبب بنتا ہے۔

ایمائل ڈرخائم (Emile Durkheim) مشہور فرانسیسی ماہر سماجیات اور فلسفی ہیں۔ جنھوں نے معاشرتی ڈھانچے کا تفصیلی مطالعہ کیا۔ ان کا اہم کام نظریہ معاشرتی حقائق ہے۔ ان کے اہم کاموں میں خودکشی کے محرکات کا مطالعہ جو انہوں نے اپنی کتاب "Suicide" میں پیش کیا ہے۔ ڈرخائم سماج میں فرد کی بجائے گروہ کو سماجی حقیقت قرار دیتے ہیں۔ معاشرہ، معاشرتی اقدار اور تغیر پذیری کے اسباب کا مطالعہ کرتے ہوئے ڈرخائم کے مطابق معاشرے کو کلی طور پر اہمیت دینی چاہیے۔ معاشرہ ایک کل ہے جس میں مختلف ادارے اپنا اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ ان اداروں میں خاندان، شعبہ تعلیم، سیاست، معیشیت سب اپنا اپنا کردار ادا کر رہے ہیں۔ کسی ایک حصے یعنی ادارے کی خرابی پورے معاشرے کی خرابی کا سبب بنتا ہے۔ ڈرخائم معاشرے کا مطالعہ کرتے ہوئے اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ تغیر پذیر سماجی اقدار مجموعی طور پر معاشرے پر کیسے اثر انداز ہوتی ہیں؟ فرد معاشرے کا حصہ ہے اس لیے اگر وہ سماجی جبر کا شکار ہے تو اسے معاشرہ کیسے متاثر ہوتا ہے؟ اور فرد بنیادی طور پر کن اقدار کو ترک کرتا ہے؟ اس کی وجوہات کیا ہیں؟ معاشرے میں کن اقدار کی تعلیم انفرادی طور پر دی جانی چاہیے اور کن کی تعلیم اجتماعی ہونی چاہیے۔ [۲] ان سب نکات کا بیان ڈرخائم نے تفصیلاً کیا ہے۔ ان کا خلاصہ اس طرح سے ہے کہ: "فرد جب تک ایک معاشرے کا حصہ ہے اس پر بیرونی دباؤ قائم رہتا ہے جس کی وجہ سے وہ معاشرتی معمولات اور رسوم کی پابندی کرتا ہے۔ یہ دباؤ معاشرے کی اداراتی زندگی میں پایا جاتا ہے۔ اس میں

عام طور پر اخلاق و آداب کے اصول شامل ہیں۔ یہ اصول ہی معاشرتی حقائق ہیں۔ ان کے دباؤ کے تحت فرد اپنی زندگی گزارتا ہے۔"(۳) ڈرخائم کے نزدیک معاشرتی حقائق کی دو اقسام ہیں۔ ا۔ مادی حقائق: جن میں مادی اشیا گھر، دولت وغیرہ شامل ہے۔ ۲۔ غیر مادی حقائق: جن میں مذہب معمولات، ثقافت وغیرہ شامل ہے جو فرد کے کردار کو متاثر کرتی ہے۔ یہی ڈرخائم کی نظر میں زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ڈرخائم کے پیش کردہ نظریے کے تناظر میں اگر دیکھا جائے تو ادب بھی ان اقدار کی پاسداری کرتا ہے جو مجموعی طور پر معاشرے کے لیے فائدہ مند ہوتی ہیں۔ بطور خاص اردو افسانے میں تغیر پذیر سماجی اقدار کی عمدہ عکاسی کی گئی ہے۔

مرزا اطہر بیگ عصر حاضر کے نمایاں ناول و افسانہ نگار ہیں۔ "بے افسانہ" مرزا اطہر بیگ کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے۔ جو ۲۰۰۷ میں پہلی مرتبہ (بے افسانہ) شائع ہوا اور ۲۰۱۳ میں دوسری مرتبہ جبکہ ۲۰۱۹ میں تیسری مرتبہ شائع ہوا۔ "بے افسانہ" میں کل ۱۳ افسانے شامل ہیں۔ کیا گھوڑے پر ظلم ہو رہا ہے؟ ، نقطالی کے بیٹے رموت کا وصیت نامہ، نامکمل۔ (پتلا)۔ کہانی، پتھر کی بریل، مورا، بلھن، دس لاکھ میں ایک، دیوار کا تھیٹر، لکھے لکھائے خطوط کا جنون، سخت پلاسٹر میں اندمال، ٹام اور جیری کی کارٹونی جدلیات: ایک تحقیقی مقالہ، ایک ناممکن کہانی، بے افسانہ۔ یہ تمام افسانے اپنے متن اور بیرون متن حاشیے میں سماجی اقدار کی عکاسی کرتے ہیں اور بعض سماجی قدروں کی تنزلی کو پیش کرتے ہیں۔ اس مقالے کے لیے مرزا اطہر بیگ کے افسانوں کے انتخاب کی اہمیت یہ ہے کہ یہ افسانے تیس برس کے دورانیے میں لکھے گئے ہیں جو موضوع کے پیش نظر ان کی اہمیت بڑھا دیتے ہیں بقول عارف وقار:

> "کتاب میں شامل کچھ کہانیاں سن ۷۰ کی دہائی میں لکھی گئی تھیں اور کچھ حالیہ دنوں میں تحریر کی گئیں، اس طرح کتاب کا دائرہ کار تیس برس سے زیادہ کے عرصہ پر محیط ہے۔ کتاب میں کہانیوں کی ترتیب بہت حد تک زمانی ہے یعنی شروع میں پرانی کہانیاں اور آخر میں تازہ تخلیقات اور یوں افسانوں کا یہ مجموعہ ایک طرح سے مصنف کے ذہنی اور فنی ارتقا کی دستاویز بھی بن جاتا ہے۔"(۴)

اس طرح زیر مطالعہ موضوع ان افسانوں میں تغیر پذیر اقدار کی عکاسی کے مطالعے کے لیے اہم دستاویز ہے۔ ارتقا سے ہی پاکستانی معاشرہ ایک ایسا معاشرہ ہے جہاں مادی تہذیب کی اجارہ داری کے بعد عزت و تکریم کی پرانی اقدار منہدم ہو چکی ہیں۔ وہاں ایسے ہی افسانے وجود میں آ سکتے ہیں۔ مرزا اطہر بیگ کے افسانے صنعتی اور معاشرتی عہد کی بدحالی کا نوحہ ہیں جہاں پہلے سے موجود معاشرتی اقدار ختم ہو رہی ہیں۔ ہم عصر افسانہ نگاری میں "بے افسانہ" کو ایک منفرد اور الگ مقام حاصل ہے اس لیے کہ اس میں عصری مسائل اور ان مسائل کے نتیجے میں پیدا ہونے والی سماجی اور اخلاقی تبدیلیاں نادر اور بہتر انداز میں پیش کی گئی ہیں اس افسانوی مجموعے

میں اس عہد کی سیاسی اور سماجی فضا سانس لیتی نظر آتی ہے۔ مرزا اطہر بیگ نے اپنے پختہ سیاسی شعور کی بنا پر اس افسانوی مجموعے میں ان تمام عناصر کا احاطہ کیا ہے جو اس زمانے کی سیاسی فضا کی تعمیر میں حصہ لے رہے تھے۔ ان کے ہاں کہانی اور اسلوب دونوں ساتھ ملتے نظر آتے ہیں اور حقائق پیش کرتے ہیں۔

افسانہ کیا گھوڑے پر ظلم ہو رہا ہے ان اقدار کی نفی کرتا ہے جو معاشرے میں رواج پا رہی ہیں۔ مثلاً افسانے کا بنیادی خیال محکمہ بے رحمی والے ہیں جو جانوروں کے حقوق کا تحفظ کرنے والا حکومتی محکمہ ہے۔ افسانہ راوی "میں" کی زبانی چلتا ہے اور خود بیتی کی تکنیک میں تحریر کیا گیا ہے۔ جس میں راوی ان محکمے والوں کی کہانی بیان کرتا ہے اور بڑے مدلل قسم کے سوالات اٹھاتا ہے۔ مثال کے طور پر ظلم کیا ہے؟ ظلم کی تعریف کیا ہے ؟ ظالم کون ہے ؟ مظلوم کون ہے ؟۔ راوی میں خود ذلتی کے احساس میں جکڑا ہوا وہ باشندہ ہے جو معاشرے کو خالصتاً اپنی نگاہ سے دیکھ رہا ہے۔ یہ معاشرہ پاکستانی معاشرہ ہے جس کو اسلامی اقدار کا پاسدار ہونا چاہیے مگر یہاں جگہ جگہ دوسروں کا استحصال روزمرہ کا معمول ہے اور یہ معمول افسانے میں ایک غریب کردار مولا بخش کے ذریعے واضح کیا گیا ہے جو کہ ایک معمولی ٹانگے والا ہے اور جس کو محکمہ بے رحمی والے روکے کھڑے تھے۔

افسانے کا واحد مرکزی کردار مولا بخش ایک نحیف و نزار بوڑھا شخص ہے۔ جس کا گھوڑا اس سے بھی کمزور تر ہے۔ محکمہ بے رحمی والوں کے ایک فرد نے مولا بخش کو اس کا جرم بتاتے ہوئے کہا کہ اس گھوڑے پر بے رحمی ہو رہی ہے۔ گھوڑے پر ظلم ہو رہا ہے۔ جب کہ مولا بخش مسلسل اس بات سے؛ انکار کرتا ہے کہ وہ گھوڑے پر ظلم کرتا ہے۔ مولا بخش کا کہنا تھا کہ گھوڑا اس سے تگڑا ہے خواہ مولا بخش کو کھانے کو کچھ نہ ملے مگر وہ گھوڑے کو لازمی طور پر کچھ نہ کچھ کھانے کو دیتا ہے۔ یہاں افسانہ جس سماجی قدر کا ابلاغ کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ معاشرہ جانور کے لیے قوانین بنا رہا ہے مگر خود انسان جو کہ اس معاشرے کا پروردہ ہے وہ ان قوانین سے محروم ہے۔ کیسا قانون ہے کہ جانور کے کھانے کے لیے لازمی کچھ ہو چاہے انسان بھوکا مر جائے۔ یہاں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیا یہی انسانی اقدار رہ گئی ہیں ؟؟؟

انسان سماجی طور پر کتنا رذیل اور پست ہو چکا ہے کہ مولا بخش جیسے غریب پر انھیں رحم نہیں آتا اور وہ اسے گالیاں دینے لگتے ہیں مولا بخش جس جسارت سے سوال کرتا ہے وہ سوال اس کی بے باکی کے گواہ ہیں مگر محکمے والے اس کی ایک نہیں سنتے اور اسے مسلسل سزا سناتے رہتے ہیں کہ گھوڑے پر ظلم ہو رہا ہے۔ اس کو کھوپے نہیں پہنائے گئے ؟ اس کی آنکھیں ننگی رکھی گئی ہیں ؟ اس کی پسلیوں پر زخم ہیں۔ اس کے گٹے سوجے ہوئے ہیں اور یہ کہ گھوڑا بہت لاغر ہے اور جب وہ محکمے والے اس کے گھوڑے کو کھولنے کی کوشش کرتے ہیں تو مولا بخش مر جاتا ہے۔ اس لمحے میں افسانہ اچانک قاری کو جس تحیر میں لاتا ہے وہاں قاری بھی راوی کی طرح چاہتا ہے کہ

پورا منہ کھول کر، پورے پھیپھڑے کھول کر، پورے جسم کا زور لگا کر گندی آلودہ نجس ہوا کا ہر ذرہ اپنے اندر بھر لے۔

سماج کو سدھارنے والے مفکرین کا دعویٰ ہے کہ سماج کو کوئی ایک شخص نہ بنا سکتا ہے نہ بگاڑ سکتا ہے۔ اجتماعی طور پر معاشرے کے ہر فرد کو باشعور اور فعال ہونے کی ضرورت ہے تب ہی وہ معاشرے کو سنوار سکتے ہیں۔ مگر اس افسانے کے تناظر میں ہم دیکھتے ہیں کہ کیسے اقدار ہیں کہ جب کسی پر ظلم ہو رہا ہو تو لوگ رک کر تماشا دیکھتے ہیں ظالم کا ہاتھ روکنے والا کوئی نہیں۔ جہاں بھی کسی کو کچھ نہ کچھ ہوتا دکھائی دیتا ہے لوگوں کے قدم وہیں رک جاتے ہیں اور دلجمعی سے تماش بین ایسے تماشا دیکھتے ہیں کہ دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے ہیں۔ افسانے کے اختتام سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حالات کتنے تبدیل ہو چکے ہیں روای ایک بڑا افسر بن چکا ہے جو ایک دور سے دوسرے دور میں کہانی کو منتقل کرتا ہے۔ معاشرے میں بس بڑے عہدے حاصل کرنا چاہتے ہیں یہی معاشرے کی ضرورت اور قدر بن چکی ہے۔ دیگر اخلاقی اقدار پستی کا شکار ہیں۔ افسانے میں انسانی استحصال ہی سماجی تغیر پذیر اقدار کی عکاس نہیں بلکہ کچھ دوسری چیزیں بھی اس جانب اشارہ کرتی ہیں۔ مثال کے طور پر

> "میں نے دیکھا تھا تو نیچے گندی نالیوں میں جھکڑ کے اڑائے ہوئے گندے اخباروں کے پرزے اور طرح طرح کی دھجیاں سلیٹی رنگ کے پانی میں بہتی جا رہی تھیں پھر میں نے سوچا کہ مجھے اصل معاملے پر توجہ دینی چاہیے۔ غلیظ پانی میں تیرتی چیزیں کوئی اہم مسئلہ نہیں ہیں۔"(۵)

اگر بغور دیکھا جائے تو انسانی معاشرے میں جہاں انسان بستے ہیں وہاں غلیظ پانی کا وجود کیونکر ممکن ہے؟ کیا انسان اس بارے میں سوچتے نہیں ہیں کہ یہ غلیظ پانی نہ صرف ماحول کو متاثر کر رہا ہے بلکہ انسانی ذہن کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ غلیظ پانی میں تیرتی چیزیں جس ذہنی گندگی کا سبب بنتی ہیں وہ ذہنی گھٹن پھر معاشرے میں جبر کی صورتوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ صاف ستھرے ماحول میں رہنے والے یا پرورش پانے والے ذہنی طور پر نہ صرف پختہ ہوتے ہیں بلکہ وہ اخلاقی طور پر بھی مضبوط ہوتے ہیں جو انسانی معاشرے کو فعال بنانے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔ یہ افسانہ سماجی اقدار کی تغیر پذیری کو واضح کرتا ہی ہے مگر کچھ دوسری باتوں کی وضاحت بھی کرتا ہے کہ ظلم، رحم، بے رحمی، جذبات وغیرہ سب کی سب اضافی چیزیں ہیں۔ موضوعی رد عمل ہیں اور معروضی طور پر یہ حقیقت ہیں۔ اسی حقیقت کو مرزا اطہر بیگ نے افسانے "نامکمل۔ (پتلا)۔ کہانی" میں پیش کیا ہے کہ کس طرح کسی کردار کو اپنے مقاصد کے لیے اچانک سے غیر اہم سے اہم بنایا جاتا ہے۔ کہانی کا مرکزی کردار سراج دین ہے جو کہ چوکیداری کرتا ہے اور جس کو پارٹی سیاست میں استعمال کرتے ہوئے پتلا بنانے کا کام سونپا جاتا ہے اور وہ پتلا بناتا رہ جاتا ہے۔

پاکستانی معاشرے کی اساس اسلام پر رکھی گئی تھی۔ اس کی اقدار بھی اسلامی ہیں۔ مگر کہانی کاروں کی تخلیقات کو دیکھا جائے تو یہ کہانیاں معاشرہ مخالف اقدار کا اظہاریہ ہیں۔ جہاں پتلا بنائے بغیر بات نہیں بن سکتی۔ جہاں جلسے جلوس، دنگا فساد اور ہنگامہ ضروری ہے۔ کہانی جس بات کا ابلاغ کر رہی ہے اس کا تذکرہ ضروری ہے کہ پارٹی کارکنان سیاسی اقدار کی پاسداری تو کرتے ہیں اور پارٹی سے ہر قسم کی وفاداری نبھاتے ہوئے ایک جلسے کی تیاری میں مگن ہیں انھیں کئی قسم کے خدشات لاحق ہیں کہ کہیں خراب موسم میں بارش نہ ہو جائے اور پارٹی کا یہ جلوس نہ ہو سکے یا پھر یہ کہ جلوس میں کسی قسم کی کوئی کمی نہ رہ جائے۔ لہٰذا اس جلوس کی تیاریاں زور و شور سے جاری ہوتی ہیں کہ اچانک پارٹی کے دو اہم کارکن سراج دین کو پتلا بنانے کی ذمہ داری سونپتے ہیں۔ دراصل یہ پتلا بنانا بھی ایک معاشرتی قدر ہے۔ جس کے تحت ضروری ہے کہ علامتی طور پر ظالم و جابر حکمرانوں کے پتلے بنا کر جلائے جائیں اور اس کے لیے انتہا کی نفرت ضروری ہے۔ نفرت کو ہمیشہ بری قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے اس کا ابلاغ کہانی میں موضوعی طور پر ہوا ہے جب کہ معروضی طور پر دیکھا جائے تو کہانی چونکہ نامکمل ہے اس لیے اس نفرت کا اظہار ضمنی سطح پر ہوتا ہے جیسے رحمان صاحب سراج دین کو پتلا بنانے کا کہتے وقت سمجھاتے ہیں کہ

> "اس کا پتلا بنانے کے لیے ضروری ہے کہ........ کہ پتلا بناتے وقت تم اپنی زندگی کے ان سب لوگوں کا تصور دل میں لانا جن سے تم نے اتنی نفرت کی ہے یا کر رہے ہو اتنی اتنی کہ اگر وہ کبھی تمھارے قابو میں آ جاتے تو تم انھیں.......... بھسم کر دیتے بس یہ جذبے دل میں اکسانا۔"(۶)

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ سیاسی طور پر خود کو فرد نے مستحکم کرنے کے لیے اس دوڑ میں خود کو کس درجہ پس ماندہ کر لیا ہے جب کہ یہ ایک سماجی قدر کی حیثیت اختیار کر گئی ہے ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ سیاست میں دوسرے پر ضرب لگاتے ہوئے آگے نکلے اور معاشرے میں اس رویے کو پسند بھی کیا جاتا ہے جب ناپسندیدہ کارکنان کے پتلے جلائے جاتے ہیں عوام کو اطمینان حاصل ہوتا ہے اور اب اس نے ایک ایسی قدر کی صورت اختیار کر لی ہے کہ ہر دوسرا سیاست دان اس دوڑ میں لگا ہوا ہے۔ کیا ایسے جذبے کا ابلاغ ضروری ہے جس کی وجہ سے نفرت پھیلتی ہو پھر کہانی ایک اور معاشرتی قدر کی تغیر پذیری اور ارتقا کی جانب اشارہ کرتی ہے کہ اب نامکمل کہانی لکھنے کا رواج فروغ پا رہا ہے۔ اقدار معاشرے کی ہی نہیں کہانی کی بھی تغیر پذیر ہیں اور کہانی بھی روایت سے ہٹ کر تحریر کی جا رہی ہے ایسی کہانی جو مکمل ہی نہیں وہ اپنا مکمل ابلاغ کیسے کر سکتی ہے۔

معاشرے میں مشینی ترقی نے انسان کو مشین کے ساتھ اور ظاہری بناوٹ سے اس قدر متاثر کیا ہے کہ ہر فرد اپنی شناخت کو پس پردہ ڈالتے ہوئے ایک دوڑ میں شریک ہو گیا اور اپنے آپ کی صحیح پہچان سے غافل ہے۔

مثال کے طور پر افسانہ "دس لاکھ میں ایک" ایک ایسی صورت حال کا ابلاغ کرتا ہے جس سے فرد کی شناخت پر سوال اٹھتا ہے۔ اس افسانے سے ایک اقتباس ملاحظہ ہو۔

> "تصویر میں کیسا بنا ٹھنا بیٹھا ہے۔ کب اتروائی ہو گی اس نے یہ تصویر۔ شناختی کارڈ کے لیے۔ کسی کو بحیثیت خاوند اپنا آپ پسند کروانے کے لیے۔ یا شاید ویسے ہی۔ زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ ویسے ہی۔ دائیں جبڑے پر زخم کا نشان۔ اس تصویر کے جبڑے پر تو زخم کا نشان نظر نہیں آ رہا۔ لوگوں کو چاہیے کہ اپنی ایک آدھ نمائندہ تصویر ایسی بھی بنوا لیا کریں جو ان کی گمشدگی کے بعد تلاش کے اشتہار میں دی جا سکے۔ یا پھر بندے کے منہ متھے کا خط اوسط سے انحراف ہی اتنا زیادہ ہو کہ ہر تصویر ہی شناختی تصویر بن سکے۔"(۷)

اقتباس جس تعبیر پذیری کا ادراک کر رہا ہے اس سے با آسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس صنعتی ترقی سے پہلے فرد خالص جیسا تھا ویسا ہی نظر آتا تھا لیکن اب حقیقت سے منہ موڑتے ہوئے ان تصاویر پر اکتفا کیا جاتا ہے اور انہیں پسند کیا جاتا ہے جن سے چہرے کو غیر ضروری طور پر خوبصورت بنا کر پیش کیا جاتا ہے اور ایسی تصویریں بنانے کو ہر دوسرا شخص ہی اہمیت دیتا ہے جس کو ہم اس سماج کی قدر کے طور پر جانتے ہیں۔ لیکن تصویر کا اصلی روپ کچھ اور ہی ہے اسی طرح شادی بیاہ کے لیے بھی تصویر میں فرد کو جیسا دکھایا جاتا ہے وہ حقیقت کے خلاف ہوتا ہے۔

مختلف سامراجی قوتوں کے توسیع پسندانہ عزائم اور اپنے مخصوص مقاصد کے حصول کی خاطر مغربی اقوام کا ترقی پذیر ممالک میں بڑھتا ہوا اثر و رسوخ، صارفی کلچر کے ذریعے معاشرتی اخلاقی اقدار کی پامالی، عالمی صارفی معاشرے کے قیام کے بعد مختلف زبانوں کو لاحق خطرات اور بڑی طاقتوں کے مخصوص ایجنڈے مرزا اطہر بیگ کے افسانوں کے اہم بیانیے ہیں۔

صنعتی ترقی کے نتیجے میں فرد کا فرد سے رابطہ منقطع ہونا اور کسی کو تضحیک کا نشانہ بنانا جیسے عوام سر عام ملتے ہیں افسانہ "سخت پلاسٹر میں اندمال" ایسے ہی ایک انسان کی داستان ہے جو کہ تہذیبی اقدار کی پامالی کا نوحہ منفرد انداز میں پیش کرتا ہے۔ جب وہ اپنی زندگی کے عجیب و غریب واقعات اور اپنے چہرے پر موجود ازلی مسکراہٹ (زبردستی کی مسکراہٹ جو ایک حادثے کے بعد اس کے چہرے کے عضلات سکڑنے کے بعد سے مسلسل موجود ہے اور ہر خوشی غمی میں اس کا چہرہ یکساں ہنستا ہوا لگتا ہے) کے نتیجے میں خودکشی کا سوچتا ہے۔ افراد کی ایسی تنہائی دراصل اس مادی عہد کی پیداوار ہے جہاں انسان اپنے جذبات و احساسات کا اظہار بھی نہیں کر سکتا ہے۔

مرزا اطہر بیگ نے معاصر عہد کی مخصوص حسیت کو اپنے افسانوں میں منقلب کرنے کی کوشش کی ہے جو اس عہد میں فرد کو درپیش خارجی اور داخلی آشوب کی زائیدہ ہے۔ دراصل انھوں نے اپنے داخلی تحرک کو اپنے ناولوں میں ہی نہیں بلکہ اپنے افسانوں میں بھی پوری فکری آزادی کے ساتھ روح عصری سے ہم آہنگ کیا جس کی وجہ سے ان کے افسانے آفاقیت کے حامل دکھائی دیتے ہیں۔ مرزا اطہر بیگ کہانی میں نئی تخلیقی فضا کا اضافہ کرتے ہیں انھیں معلوم ہے کہ کس وقت کس تکنیک کے استعمال سے کہانی میں نیا پن پیدا کیا جا سکتا ہے۔ ان کی کہانیوں بلھن، دس لاکھ میں ایک، دیوار کا تھیٹر، لکھے لکھائے خطوط کا جنون، سخت پلاسٹر میں اندمال، ٹام اور جیری کی کارٹونی جدلیات: ایک تحقیقی مقالہ، ایک ناممکن کہانی، بے افسانہ میں مختلف تکنیک کا استعمال ان کے عمدہ فن کی عکاسی ہے۔ ان میں تغیر پذیر سماجی اقدار کی خوبصورتی سے عکاسی کی گئی ہے۔ ان کے مطالعے سے ماہر سماجیات ایمائل ڈرخائم کے نظریے جس کے مطابق معاشرے کے کسی ایک ادارے کی خرابی پورے معاشرے کو متاثر کرتی ہے پوری طرح عیاں ہوتی ہے اور یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے انسانی جسم کے کسی ایک حصے کی تکلیف پورے انسانی وجود کو متاثر کرتی ہے ان افسانوں کے مطالعے سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ کیسے معاشرے میں ایک سطح پر خرابی پورے معاشرے کی خرابی کا سبب بنتی ہے۔

مرزا اطہر بیگ لاشعوری طور پر اپنی کہانیوں کو ان دیکھی دنیاؤں کا حوالہ بنا کر پیش کرتے ہیں۔ انھیں معلوم ہے کہ انھیں کیا کہنا ہے؟ کس طرف کہانی کا رخ رکھنا ہے؟ اور کہاں پہنچ کر انھیں نتیجہ خیز ثابت ہونا ہے؟ انھیں کس معاشرتی برائی کو کب اور کیسے آشکار کرنا ہے؟ ان کے افسانوں میں حسی تجربات صنعتی اور مشینی عہد میں فرد کی ذات کو درپیش داخلی تنہائی، وجودی کرب اور لایعنیت جیسے رجحانات کی عکاسی ملتی ہے۔ ان کی کہانیاں روایتی بیانیے سے ہٹ کر ہیں۔

مرزا اطہر بیگ کے افسانوں میں معاشرتی اقدار کا نوحہ جتنی شدت سے بیان کیا گیا ہے وہ محدود تناظر میں زمان و مکان کی حد تک محدود نہیں بلکہ ان کے افسانوں میں وہ لازمانی معاصریت پائی جاتی ہے جس کی وجہ سے ان کے افسانوں کا متن غیر پابند بن جاتا ہے۔ مرزا اطہر بیگ کے افسانوں کا ایک اختصاص یہ بھی ہے کہ یہ افسانے جدید اور مابعد جدید افسانوں میں حد فاصل قائم کرتے ہیں۔ اس لیے کہ لسانی فکری ساختیاتی اور ہئیتی تناظر میں یہ افسانے ایسے ہیں جن میں مابعد جدیدیت کے خد و خال واضح نظر آتے ہیں۔ قدیم اقدار ختم ہو رہی ہیں۔ صنعت و حرفت اور جدید ذرائع ابلاغ کی ترقی کے ساتھ ساتھ عالمی صارفی معاشرے کے قیام کی طرف پیش قدمی نے بھی معاشرے کی اندرونی ساخت کو بری طرح متاثر کیا ہے جس کی ایک واضح جھلک مرزا اطہر بیگ کے افسانوں میں ملتی ہے۔

حوالہ جات وحواشی

۱. Shankar Rao, C.N., Sociology Principles of sociology with an introduction to Social Thought, (Karnataka, Mangalore seventh edition) P.۴۶۹

۲. Emile Durkheim, The Rules of Sociological Method, (New York The Free Press,۱۹۸۲).

۳۔ عبدالحمید تگہ، پروفیسر، عبدالعزیز تگہ، عمرانی نظریہ و تحقیق، (لاہور، امتیاز بک ڈپو، ۲۰۱۰،) ص ۷۸

۴۔ عارف وقار، مرزا اطہر بیگ کے افسانے، https://www.bbc.com/urdu/entertainment/story/۲۰۰۸/۱۰/۰۸۱۰۱۱_athar_beg_novel_np ۲۶۔۱۲۔۲۰۲۱.

۵۔ مرزا اطہر بیگ، بے افسانہ، (لاہور، سانجھ پبلشر، ۲۰۱۳،) ص ۱۱

۶۔ ایضاً ص ۳۱

۷۔ ایضاً ص ۶۶